IQBAL REVIEW (65: 2)
(April – June 2024)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

علامہ محمد اقبال اور ناصر خسرو کے افکار

ڈاکٹر نیک عالم راشد
پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی، کراچی

ABSTRACT

It is a fact that every thinker, philosopher, poet and writer is influenced by the society and also creates his reciprocal impact. The poets ponder over different phenomenon of society, draw conclusions from them and bring forward the results of their thinking in the form of artistic creation. It is the influence of Allama Muhammad Iqbal and Nasir Khusro's thought and philosophy that even after so many years, the people of knowledge and wisdom are still making equal use of their ideas and thoughts. Both poets described their wisdom and philosophical thoughts in their poetry. Iqbal, in his poetic work Javed Nama, had a spiritual meeting with Hakim Nasir Khusro in Falak-ul-Aflak. According to Iqbal, the soul of Nasir Khusro Alavi appeared there and disappeared after singing a ghazal. We can see the thoughts of Nasir Khusro Alavi on politics, religion, literature and knowledge in the poetical works of Allama Muhammad Iqbal.

Keywords:
Knowledge, Wisdom, Spiritual Meeting, Literature, Poetical Workds

ہمارے قومی شاعر، بیسویں صدی عیسوی کے مسلمان فلسفی، حکیم الامّت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) ہیں۔ علامہ محمد اقبال کے پیشرو مفکرین میں سے ایک پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے ممتاز فلسفی شاعر اور مفکر حکیم ناصر خسرو بلخی بھی ہیں۔ اس مقالہ میں یہ جائزہ لیا جائے گا کہ علامہ محمد اقبال اور حکیم ناصر خسرو کے افکار میں کس قدر مماثلت ہے۔

علامہ محمد اقبال کا تعلّق پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ کے ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک صوفی منش بزرگ تھے بلکہ ایک ماہر اقبالیات کے بقول، "شیخ نور محمد زاہدِ شب زندہ دار اور صوفیٔ تقویٰ شعار تھے۔"[۱] اس طرح ان کا پورا گھرانہ دیندار تھا۔ اس دینی اور روحانی پس منظر کے سبب علامہ محمد اقبال بنیادی طور پر روحانی الذّہن اور دینی رجحانات کے حامل شخص تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران ان کا زیادہ تر رجحان دینیات اور فلسفے کی طرف رہا۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم۔ اے کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربک ریڈر اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر رہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلے گئے جہاں سے انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر جرمنی کی مشہورِ زمانہ میونخ یونیورسٹی سے "ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء" (The Development of Metaphysics in Persia) پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔[۲]

اقبال نے نثر اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں ان کے بے شمار خطوط کے علاوہ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ایران میں مابعد الطبعیات، جو 'فلسفۂ عجم' کے نام سے اردو میں شائع ہوا ہے، اور انگریزی میں ان کے خطبات کا مجموعہ *The Reconstruction of Religious Thought in Islam* جس کا اردو ترجمہ تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ کے نام سے ہوا ہے، زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم، اقبال نے اپنے فکر و فلسفے کے ابلاغ کے لیے زیادہ تر شاعری کا پیرایہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے اور دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں: جیسے بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، اسرار و رموز، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، رمغانِ حجاز اور پس چہ باید کرد اقوامِ شرق۔

علامہ اقبال نے اپنے تعلیمی کیریئر اور بالخصوص اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مطالعے کے دوران اسلامی تاریخ و تعلیمات اور خاص طور پر ایرانی مسلم فکر و فلسفے اور تصوّف و عرفان سے کماحقّہ آگاہی حاصل کی اور الغزالی، ابن عربی، رومی اور الجیلی کے افکار و آراء سے انھیں براہ راست شناسائی ہوئی۔ اقبال اپنی ایک تحریر میں واضح طور پر لکھتے ہیں کہ ان کے فلسفے کی بنیاد مسلمان صوفیا اور حکیموں کی تعلیمات پر استوار ہے بلکہ ان کا فلسفہ ان کی تعلیمات کا تکملہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ”میرا جو فلسفہ ہے وہ قدیم مسلمان صوفیہ و حکما ہی کی تعلیمات کا تکملہ ہے، بلکہ بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیے کہ یہ جدید تجربات کی روشنی میں قدیم متن کی تفسیر ہے۔“[۳] اگرچہ اقبالیات کے ماہرین اور فکرِ اقبال کے حامی دانشوروں نے اقبال کے پیشرو ان تمام مغربی و مشرقی مفکرین و فلاسفہ اور مسلم صوفیاء و حکماء کا تذکرہ شرح و بسط سے کیا ہے جن کے فکر و فلسفے کا فکرِ اقبال کے ساتھ کوئی تعلق مشابہت یا مماثلت بنتی تھی۔

ناصر خسرو قرنِ پنجم ہجری کے مسلم شعراء، حکماء، متکلمین اور فلاسفہ میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ناصر خسرو بلخ کے نزدیک ایک گاؤں قبادیان میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلّق خاندانِ محتشمی سے تھا اس لیے انھیں تعلیم و تربیت کا بہترین موقع میسّر رہا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے زمانے کے تمام مروّجہ علوم جیسے صرف و نحو، ادب، منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، فلسفۂ یونان، تقابلِ ادیان اور تصوّف و عرفان حاصل کیے۔ اس سلسلے میں ایرانی محقّق مرحوم تقی زادہ دیوانِ اشعار کے اوّلین ایڈیشن کے دیباچے میں رقمطراز ہیں کہ ”ناصر خسرو نے ... اس زمانے کے تقریباً تمام متداولہ عقلی و نقلی علوم میں اور خاص طور پر یونانی علوم اور خصوصی طور پر حساب و نجوم و فلسفہ اور اس طرح علمِ کلام اور حکمت متالٰہین میں تبحّر پیدا کیا ... ناصر خسرو نے علم ملل و نحل اور مذاہب و ادیان کے متعلّق معلومات حاصل کرنے کے لیے بہت تکالیف اٹھائیں۔“[۴] اور یوں، بقولِ مولوی عبد الرّزاق کانپوری، ”تقریباً چوالیس (۴۴) سال کی عمر میں ناصر خسرو ایک عدیم النّظیر حکیم، فلسفی، عالم، مناظر اور شاعر بن گیا۔“[۵]

ناصر خسرو نے تمام کتابیں فارسی زبان میں لکھیں اور نثر و نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کی دستیاب تصانیف میں دیوانِ اشعار، روشنائی نامہ، سعادت نامہ، شش فصل، سفر نامہ، وجہ دین ، گشائش و رہائش، خوان الاخوان ، زاد المسافرین اور جامع الحکمتین شامل ہیں۔ ان تصانیف میں ناصر خسرو نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن میں یونانی و اسلامی فلسفہ اور ان کے مابین موازنہ، اسلامی فکر و فلسفے کی افضلیّت و حقّانیت، قرآنی علوم، علمِ حدیث،

اسلامی تعلیمات، اخلاقیات، حضرت نبی محمد ﷺ اور آپ کی اہل بیت اطہار اور امام۔ خلیفہ مستنصر باللہ اوّل (متوفی۔۴۸۷ھ) کی تعریف و توصیف، نیز متکبّر و ظالم حکمرانوں اور ابن الوقت قسم کے شعراء و علماء کی مذمّت اور بدگوئی شامل ہے۔

ناصر خسرو کے فکر و فلسفے کی پائیداری اور اثر و نفوذ کا یہ عالم ہے کہ ایک ہزار سال گذرنے کے باوجود آج بھی اہلِ علم و دانش ان کے نظریات و افکار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ مابعد کے مصنّفین و مفکرین ناصر کی نثری و شعری دونوں تصانیف سے متأثر ہوئے لیکن ایسا دکھائی دیتا ہے کہ زیادہ تعداد ان اربابِ دانش کی ہے جو اُن کی شاعری سے متأثر ہوئے ہیں۔ کیونکہ ناصر خسرو وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے حکیمانہ و فلسفیانہ مسائل کو فارسی شاعری میں بیان کیا ہے۔ بلاشبہ ان کا دیوانِ اشعار اسلامی علوم و معارف، قرآنی تشریحات و تاویلات، عقائد و عبادات، اخلاقیات، سیاسیات و عمرانیات کے حوالے سے اسلامی نقطہ ہائے نظر اور فلسفیانہ تصوّرات کے ایک انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتا ہے۔ ناصر کے فکر و فن کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں مقاصد کے تعیّن میں کہیں ابہام نظر نہیں آتا اور وہ دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں پیش کرتے ہیں کہ جن کے مطالعے سے قارئین کو ان کے مافی الضّمیر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ہمارے اس دعوے کی تائید سیّد نصر اللہ تقوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> یعنی اس بندے کے عقیدے کے مطابق حکیمِ ربّانی ناصر خسرو کا دیوان اسلوب کی متانت، الفاظ کی موزونیت، تراکیب کی بلاغت، معنی و مفہوم کی لطافت، بیان کی نُدرت نیز حکمت کے مفاہیم پر مشتمل اور خلاصۂ معرفت اور مواعظِ حسنہ سے بھرپور ہونے اور آفاق و انفس کی آیات سے پردہ ہٹانے میں وحیِ آسمانی کی خاصیت رکھتا ہے اور ختمِ رُسل کے نور کے آفتاب کی شعاعوں کی مدد سے روشنی فراہم کرتا ہے۔[۶]

ناصر خسرو کے فکر و فن سے متأثر ہونے والے اور ان کی تصانیف سے خوشہ چینی کرنے والے مابعد کے شاعروں، نثر نگاروں، دانشوروں اور مفکروں کی ایک بڑی تعداد کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے جن میں ثنائی، عطّار، رومی، حافظ، سعدی، محمود شبستری، اور حکیم نزاری قہستانی سے لے کر برِّ صغیر ہند کے میرزا اسد اللہ خان غالب اور خواجہ الطاف حسین حالی تک شامل ہیں۔

اقبال نے اپنی شعری تصنیف جاوید نامہ، جو ۱۹۳۲ء میں منصّۂ شہود پہ آگئی، اور بقولِ اقبال، ڈینٹے کی ڈیوائن کامیڈی کے اسلوب اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر رکھی ہے، عالمِ بالا کے

تخیّلی سفر کے دوران مختلف نام آور علمی شخصیتوں سے فکری ملاقات کی۔ اس دوران فلک الافلاک میں حکیم ناصر خسرو سے ان کی روحانی ملاقات ہوتی ہے۔ بقولِ اقبال، ''نمودار می شود روحِ ناصر خسرو علوی و غزلے مستانہ سرائیدہ غائب می شود۔''[۷] یعنی ناصر خسرو علوی کی روح نمودار ہوتی ہے اور ایک مستانہ غزل گا کر غائب ہو جاتی ہے۔

اقبال نے روحِ ناصری کی مذکورہ سرودہ غزل کے جو اشعار اپنی اس شاہکار شعری تصنیف جاوید نامہ میں درج کیے ہیں ان میں سے چنیدہ اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

'' دست را چوں مرکبِ تیغ و قلم کردی مدار | ہیچ غم گر مرکبِ تن لنگ باشد یا عرن
از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید ہنر | اے برادر ہمچو نور از نارو نار از نارون
بے ہنر دان نزدِ بے دیں ہم قلم ہم تیغ را | چوں نباشد دیں نباشد کلک و آہن را ثمن[۸]

جب تمھارا ہاتھ قلم اور تلوار کو مضبوطی سے تھام لے تو پھر اس کے بعد ہی اپنے گھوڑے کو فضیلت کے میدان میں دوڑاؤ۔

اے میرے بھائی! تلوار اور قلم کی نوک سے ہنر ایسا جنم پاتا ہے جیسے روشنی آگ سے اور آگ نارون کے درخت سے جنم پاتی ہے۔

بے دین آدمی کے نزدیک قلم اور تلوار دونوں کو بے ہنر سمجھو، جب دین ہی نہ ہو گا تو اس صورت میں تلوار اور قلم کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔

یاد رہے کہ مذکورہ اشعار ناصر خسرو کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں۔ اور یہ کہ دیوانِ اشعارِ ناصر خسرو کا پہلا ایڈیشن ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء میں تبریز سے شائع ہوا، دوسرے ایڈیشن کی اشاعت ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں تہران سے ہوئی جبکہ تیسرے ایڈیشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس دیوان کا منتخب مجموعہ ہندوستان سے بھی شائع ہوا لیکن اس کی تاریخ اشاعت معلوم نہیں۔ اور چوتھا اور صحت مند ایڈیشن سیّد نصر اللہ تقوی مرحوم کی کوششوں سے ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء میں تہران سے شائع ہوا۔ معلوم ہوا کہ ناصر خسرو کے دیوان کے مذکورہ تمام ایڈیشنز علامہ اقبال کے جاوید نامہ کی اشاعت سے بہت پہلے شائع ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ دیوانِ اشعار لازماً علامہ اقبال کے زیرِ مطالعہ آئی ہو گی۔ تب تو انھوں نے ناصر خسرو کے منظوم افکار کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔

بہر کیف، ان مذکورہ اشعار میں ناصر خسرو کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قلم اور تلوار یعنی علم و ادب اور سیاست و حکومت کو دین کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر یہ دونوں طاقتیں دین کے تابع ہوں گی تو اس کے نتیجے

میں انسانی معاشرہ صحت مند بنیادوں پر ترقّی کرے گا، تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملے گی، تحقیقی سرگرمیاں فروغ پائیں گی، عدل و انصاف کا بول بالا ہو گا، بے چینی و بے یقینی کی فضا کافور ہو گی، امن و امان یقینی ہو گا اور انسان کو سکھ اور طمانیت نصیب ہو گی۔ناصر خسرو قرون وسطیٰ کے بہت سے مسلمان علماء اور دانشوروں کی طرح اس نقطۂ نظر کے حامل تھے کہ دین و سیاست اور دین و ادب کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے یہ تو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ بلکہ رستگاری اسی میں ہے کہ دوسرے دنیوی امور پر دین کی بالادستی ہو۔درحقیقت ناصر خسرو جس سیاسی و دینی نظام یا دوسرے الفاظ میں دولت و دعوت یعنی مصر کی فاطمی خلافت اور نظامِ دعوت کی نمائندگی کر رہے تھے اس میں دین و سیاست اور دعوت و دولت میں ہم آہنگی و موافقت اپنے عروج پر تھی۔اس کا اعتراف دَورِ جدید کے ثقہ مؤرّخین بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ جامع ازہر اور جامع قاہرہ کے سابق پروفیسر اور عربی زبان و ادب اور تاریخ کے عالم و محقّق محمد حسن الاعظمی رقمطراز ہیں کہ:

> فاطمی عہدِ خلافت پر اگر ایک مخلص مؤرّخ کی حیثیت سے نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اُس عہد کا سب سے زرّین کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے یہ ثابت کر کے بتایا کہ اسلام کے دعوے کے مطابق سیاست اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ہرگز ایسے دو متضاد نظریئے نہیں جن کا عملی اجتماع محال ہو بلکہ برعکس اس کے ان دونوں کی علیحدگی جسم و جان کی علیحدگی کے مانند موجب فنا بن جاتی ہے۔[۹]

نیز حسن الاعظمی یہ تاکید بھی کرتے ہیں کہ اسلام کا صحیح اور مکمّل تصوّر اُس وقت تک ہرگز ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ ان دونوں اہم اجزاء کو افراط و تفریط سے بچتے ہوئے یکجا نہ کیا جائے۔[۱۰]

علامہ اقبال نے اپنی منظوم اور منثور دونوں تصانیف میں جگہ جگہ اس نقطۂ نظر کو دہرایا ہے کہ دین و سیاست اور دین اور ادب و علم کے درمیان تفریق نہیں ہے۔اقبال نے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے ہندوستان ریویو کے لیے ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا، یہ تحریر کیا ہے کہ:

> اسلامی قانون کے مطابق مذہب اور سیاست میں کوئی امتیاز و تفریق نہیں۔ ہمارے لیے ریاست مذہبی امور اور دنیاوی حکمرانی کا امتیاز نہیں بلکہ یہ ایک ایسی وحدت ہے جس میں اس قسم کی تقسیم کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔[۱۱]

علامہ اقبال نے جہاں نثر میں اپنے سیاسی نظریات کی تشریحات و تعبیرات پیش کی ہیں وہاں شاعری میں بھی جابجا ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔وہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں کہ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی[۱۲]

علامہ اس شعر میں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ جو بھی سیاسی نظام ہو خواہ وہ بادشاہت کا روایتی نظام ہو یا جمہوریت کا جدید نظام ہر صورت میں دین و سیاست میں تفریق و تقسیم نہ ہونا چاہیے بصورتِ دیگر معاشرے میں ظلم و بربریت اور بے رحمی کا راج ہو گا اور رحمت للعالمینی نظام کی جگہ چنگیزیت لے لے گی۔ اسی طرح علامہ نے دین و سیاست کی علیحدگی کے بدترین نتائج سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے۔ وہ بالِ جبریل میں فرماتے ہیں کہ:

سیاست سے مذہب نے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کے لیے نابصیری[۱۳]

اقبال یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر بہ فرض محال سیاست دینی حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو یہ اہلِ اسلام کے لیے بے حد خسارے کا سودا ہو گا۔ وہ 'ارمغانِ حجاز' میں یوں گویا ہیں کہ:

دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا[۱۴]

علامہ کی ان آراء سے یہ نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ وہ دین و سیاست کے درمیان ایک اٹوٹ رشتے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں دین و سیاست کی یکجائی سے یا زیادہ درست مفہوم میں سیاست کے دین سے رہنمائی حاصل کرنے سے سیاست میں اخلاقی روح پیدا ہو گی اور نتیجتاً سیاست عدل و انصاف، مساوات اور خیر و عافیت کی شاہراہ پر گامزن ہو گی اور انسانی معاشرے کے لیے جائز نفع رسانی کا سامان فراہم کرے گی۔ بصورتِ دیگر معاشرے میں ظلم و بربریت، بے رحمی اور انار کی کا دَور دَورہ ہو گا۔

جس طرح حکیم ناصر خسرو دین و سیاست کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتے ہیں اسی طرح وہ دین اور علم و ادب کو بھی ایک دوسرے سے الگ قرار نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ دین کے بغیر ادب و فن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ناصر کے مذکورہ بالا اشعار میں سے ایک شعر یہاں بارِ دگر درج کیا جاتا ہے:

بے ہنر دان نزدِ بے دیں ہم قلم ہم تیغ را
چوں نہ باشد دیں نہ باشد کلک و آہن را ثمن[۱۵]

یعنی بے دین آدمی کے نزدیک قلم اور تلوار دونوں کو بے ہنر سمجھو، جب دین ہی نہ ہو گا تو اس صورت میں تلوار اور قلم کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔

علامہ اقبال بھی اسی نقطۂ نظر کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ دین اور علم و ادب کے باہمی رابطے کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شعر و سیاست اور دین و ہنر ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے دانوں کی طرح ہیں۔ وہ ضربِ کلیم میں "دین و ہنر" کے موضوع کے تحت لکھتے ہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اس کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا افسانہ[16]

اقبال کی نظر میں فن، خواہ نثر ہو یا شاعری، موسیقی ہو یا مصوّری یا کوئی اور فن جب تک انسان کے قلب و ذہن میں مثبت تبدیلی نہیں لاتا اور معاشرے کی درست تعمیر و تشکیل نہیں کرتا وہ بے معنی ہے۔ موصوف مختلف مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا[17]

اقبال نے اس شاعری پر بھی تنقید کی ہے جس کی بنیاد جھوٹی اور افسانوی روایات پر استوار کی گئی ہو جو قوم اور خاص طور پر اس کے نوجوان طبقے کے سامنے غلط نصب العین پیش کر کے ان کے نظریۂ حیات اور اخلاق کو بگاڑے۔ وہ تو قطعی طور پر کہتے ہیں کہ اس قسم کی شاعری کے ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر ہے۔ فرماتے ہیں کہ

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستان
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز[18]

حکیم ناصر خسرو تمام علوم پر علمِ دین کی فوقیّت اور بالا دستی کے قائل ہیں خواہ وہ شاعری ہو یا نثر، سیاست ہو یا حکومت اور فلسفہ ہو یا سائنس۔ اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے دیوان میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اور یہ نقطۂ نظر اُن کے بنیادی افکار کا حصّہ ہے۔ ناصر ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

سرِ علمہا علمِ دین است کان — مثل میوۂ باغِ پیغمبریست
بدین از خری دُور باش و بدان — کہ بیدینی اے پور بیشک خریست[19]

تمام علوم میں علمِ دین ہی سر کا درجہ رکھتا ہے جس کی مثال پیغمبرِ اسلام کے لگائے ہوئے باغ کے میوے کی سی ہے۔

اے بیٹے! دین ہی کے ذریعے حیوانیت سے دُور ہو جا اور جان لے کہ بے دینی ہی یقیناً حیوانیت ہے۔

حکیم فرزانہ ایک اور مقام پر علمِ دین کی اہمیّت بیان کرتے ہوئے اپنے مخاطب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ علمِ دین کے ذریعے زندگی کی حقیقی مسرّت و شادمانی حاصل کرے اور غم و اندوہ سے خود کو بچا لے۔ فرماتے ہیں کہ

زندگی و شادی اندر علمِ دین است اے پسر
خویشتن را گر نہ مستی مست و مجنوں چوں کنی [۲۰]

اے بیٹے! (حقیقی) زندگی اور (سچی) خوشی دین کے علم میں ہے تو (علمِ دین سے بیگانہ ہو کر) اپنے آپ کو کیوں متوالا اور پاگل بناتے ہو۔

حکیمِ خراسان دینی و روحانی علم کی اہمیّت و فضیلت کو ایک اور شعر میں بڑے حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

راحتِ روح از عذابِ جہل در علم است ازانک
جُز بہ علم از جانِ کس ریحانِ راحت نشگفید [۲۱]

جہالت کے عذاب سے خلاصی اور روح کی راحت کا راز علمِ (دینی و روحانی) میں ہی مضمر ہے۔ اس (دینی و روحانی) علم کے سوا کسی بھی فردِ بشر کے دل میں روحانی راحت کی ناز و بو نہیں کھلی۔

ناصر خسرو کی طرح علامہ اقبال بھی علمِ دین کو بنیادی اہمیّت دیتے ہیں اور ان کی نظر میں دوسرے تمام علوم کو دین کے تابع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے خواجہ غلام السّیّدین کو ایک خط لکھا تھا جس کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کیا ہے اس علم سے وہ طبعی قوّت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنیت ہے مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ [۲۲]

اقبال اپنے فارسی مجموعۂ کلام جاوید نامہ میں تو برملا طور پر کہتے ہیں کہ

کور را بینندہ از دیدار کن
بولہب را حیدرِ کرّار کُن! [۲۳]

اقبال کی نظر میں اگر یہ بولہب حیدر کرّار بن جائے یا دوسرے الفاظ میں اس کی قوّت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لیے سراپا رحمت ہے۔

ناصر خسرو کے نزدیک جس طرح دینی علم تمام علوم کا سردار ہے اسی طرح تمام دینی علوم کا منبع و مصدر قرآن کریم اور تعلیمات نبویؐ ہیں۔ ان کی شخصیت کی فکری پختگی کی بنا ان کی قرآن خوانی اور قرآن فہمی تھی۔ اس بارے میں ناصر خود فرماتے ہیں کہ

خواندنِ فرقان و زُہد و علم و عمل

مونسِ جانند ہر چہار مرا[۲۴]

قرآن کا مطالعہ، زُہد، علم اور عمل یہ چاروں عوامل میری روح کے یار و غمخوار ہیں۔

چنانچہ ناصر خسرو کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسی دینی و روحانی شاعری کی بنیاد قرآن و حدیث پر استوار ہونی چاہیے۔ کیونکہ جب شعر و ادب کی عمارت قرآنی تعلیمات پر تعمیر ہو گی تو بالواسطہ پورے انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل درست اور مستحکم بنیادوں پر ہو گی۔ اس لیے ناصر خسرو کا یہ موقف ہے کہ شاعری کی بنیاد قرآن و حدیث پر استوار ہونا چاہیے اور جو شاعری قرآن و حدیث کی تعلیم سے بیگانہ ہو وہ آپ کے نزدیک ایک لغو اور بیہودہ شے ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

فریدوں فخر اگر خواہی نہ قرآن و حدیث آور

کہ کارِ شاعران یکسر خیالات است کذّابی[۲۵]

تجھے فریدون بادشاہ کی طرح فخر چاہیے تو اے شاعر! تو ہمیشہ قرآن و حدیث کی روشنی میں شاعری کر لیا کر۔ اس سے ہٹ کر شاعری کرنا محض جھوٹے خیالات کا ایک پلندہ ہے۔

ناصر خسرو کی طرح اقبال بھی قرآن کی عظمت کے قائل ہیں اور ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں بھی قرآن پاک اور تعلیمات نبویؐ کار فرما رہی ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان لکھتے ہیں کہ ''عشقِ رسولؐ اور قرآنِ مجید ہی سے علامہ اقبال کے شخصی عناصر (Personal elements) کی تعمیر ہوئی ہے۔''[۲۶] یہی وجہ ہے کہ اقبال کا اوڑھنا بچھونا اور ان کے فکر کا محوّر و مرکز قرآن رہا ہے۔ اس لیے جدید دَور کے مفکرین و محققین اقبال کو قرآن کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر مجیب حسین مصری، جو کہ اقبال کے عاشقِ صادق تھے، کہتے ہیں کہ: '' شاعرِ اسلام فلسفی علامہ محمد اقبال قرآن کے شاعر تھے اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں کہوں گا وہ شاعروں میں قرآن تھے۔''[۲۷] بلاشبہ، ان کے نزدیک قرآن مسلم امّت کی دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی و کامرانی کے لیے نسخۂ کیمیا اور رہنما اصولوں کا مصدر و ماخذ کا حکم رکھتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن[۲۸]

(اے مخاطب!) اگر تُو مسلمان (کی حیثیت سے) زندہ رہنا چاہتا ہے تو (جان لے کہ) قرآن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔

اقبال اسرار و رموز میں فرماتے ہیں کہ قرآنِ حکیم مسلم امّت کی عقلی زندگی کے لیے قوّت اور اس کی حکمت یعنی جوہر اس عقلی زندگی کے حق میں شہ رگ کا حکم رکھتا ہے۔ شعرِ اقبال یہ ہے کہ

قلبِ مؤمن از کتابش قوّت است
حکمتش حبل الورید ملّت است[۲۹]

مومن کا دل اس کی کتاب (قرآن) سے مضبوط ہوتا ہے۔ اس کی حکمت (مسلم) قوم کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک قرآن حکیم ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا حرف وصوت یعنی ظاہرِ قرآن بھی خدا کا معجزہ اور امّتِ مسلمہ کی طاقت و توانائی کا سرچشمہ ہے اور اس کا باطن یعنی حکمت و فلسفہ اس نسخۂ کیمیا کا حکم رکھتا ہے کہ جس میں امّت کی عقلی و سماجی زندگی کا وافر سامان بھی فراہم ہے اور بجا طور پر حکمتِ قرآن ملّتِ اسلامیہ کی شہ رگ ہے۔

حکیم ناصر خسرو اور علامہ اقبال دونوں شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی اور دونوں دینِ اسلام کے پُر جوش داعی بھی ہیں۔ اس لیے دونوں اسلام کی عظمت رفتہ کے قدردان بھی ہیں اور معترف بھی۔ دونوں نے اس کا دل کھول کر اظہار بھی کیا ہے۔ ناصر خسرو نے پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں مسلم دنیا کے حالات کا ذکر اگرچہ اپنے 'سفر نامہ' میں کیا ہے اور خاص طور پر مصر میں مادّی ترقّی، معاشی خوشحالی اور اطمینان بخش معاشرتی صورتِ حال کے متعلّق اپنے مشاہدات خوبصورت طریقے سے بیان کیے ہیں۔ لیکن انھوں نے مصر کی شان و شوکت اور خاص طور پر قاہرہ شہر، جو کہ مصر کی خلافتِ فاطمیّہ کا دارالخلافہ تھا، کی علمی ترقّی، دانشورانہ روایت اور عقلی و روحانی احوال کا نقشہ جس کمالِ مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ تمثیلی پیرائے میں اپنے اشعار میں کھینچا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف اور لائقِ تحسین ہے۔ ان کے اشعار یہ ہیں

روزی برسیدم بدرِ شہری کانرا — اجرامِ فلک بندہ بُد آفاق مسخّر
شہری کہ درو نیست جز از فضلِ منازل — باغی کہ درو نیست جز از عقل صنوبر

شہری کہ درو دیبا پوشند حکیماں | نہ بافتۂ مادہ و نہ بافتۂ نر[۳۰]

ایک دن میں ایک ایسے شہر کے دروازے پر پہنچا کہ جس کے لیے اجرامِ فلکی غلام اور پوری کائنات مسخّر تھی وہ ایسا شہر تھا کہ جس میں خالص عقل کے صنوبر اُگے ہوئے تھے۔ اس شہر میں حکماء ایسے ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو نہ کسی مرد کا بُنا ہوا تھا اور نہ کسی عورت کا کاتا ہوا۔

اسی طرح علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس کے بعد جب اسپین گئے اور وہاں مسلمانوں کے دَورِ عروج کی دینی و علمی یادگاری عمارات، جیسے مسجدِ قرطبہ اور الحمرا کا معائنہ کیا تو اس عظمتِ رفتہ کے متعلّق اپنے تاثرات شعری پیرائے میں قلمبند کیے۔ خاص طور پر وہ مسجدِ قرطبہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"[۳۱] وہ اس مسجد کو 'کعبۂ اربابِ فن' اور 'سطوتِ دینِ مبین' قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں | تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر | قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے | بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے[۳۲]

"مسجدِ قُرطبہ" ایک طویل نظم ہے جس کے چند اشعار اوپر پیش کیے گئے۔ جس طرح مسجدِ قُرطبہ اسلامی فنِ تعمیر کا شاہکار نمونہ ہے اسی طرح اس سے منسوب یہ نظم بھی شاعرانہ حُسن کاری، تاریخی اور فلسفیانہ موشگافی اور جذباتی و جمالیاتی تصویر کشی کے اعتبار سے ایک عظیم شاہکار ہے۔ اردو ادب کے ایک مصنّف اور نقّاد جابر علی سیّد اقبال کی اس نظم کے متعلّق اپنے تاثرات اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ

"مسجدِ قرطبہ" ایسی نظم ہے جو خود بھی "مسجدِ قرطبہ" کا سا جلال و جمال اور حُسنِ تنظیم رکھتی ہے۔ اس کے بند اور ان کا باہمی تعلّق ابھرتے ہوئے مصرعے ایسے ہیں کہ مسجد کے ستونوں کی طرح نظر کے سامنے ابھرتے چلے آتے ہیں۔[۳۳]

اقبال صقلیہ یعنی جزیرۂ سسلی کی تاریخی عظمت و سطوت کے گیت الاپتے ہیں اور پھر اس کی ویرانی کا رونا بھی روتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبابہ بار | وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی | بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور | کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا | آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا
غلغلوں سے جن کی لذّت گیر ابتک گوش ہے | کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے [۳۴]

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جس فکر کی بنیاد پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی میں حکیم ناصر خسرو ڈال رہے تھے چودھویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی کے حکیم الامّت علامہ اقبال اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا رہے تھے۔ اس کی توثیق معروف جرمن اسکالر این میری شمل کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ لکھتی ہیں کہ:

> ... Iqbal set out to accomplish exactly what that Nasir-i Khusrau had done nine centuries before him: namely, an endeavour to understand Islamic thought in philosophical terms and also through the Western thought...[35]

اس مختصر سے مطالعے میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ بہت سی انسانی اور اسلامی قدریں ایسی بھی ہیں کہ کوئی زمانی یا مکانی بُعد یا یہ کہ کوئی سیاسی، سماجی، معاشی اور سائنسی تبدیلیاں یا مسلکی اختلاف ان کو یکسر تبدیل نہیں کر سکتی ہیں، البتّہ انھیں نئے پیرائیوں، نئی تعبیروں اور نئے سانچوں میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا تجربہ ڈاکٹر محمد اقبال اور حکیم ناصر خسرو کے افکار کے موازنے سے ہوا۔ کیونکہ ناصر خسرو اور اقبال کے درمیان کم و بیش نَو سَو (۹۰۰) سال کا زمانی بُعد حائل ہے جبکہ ان میں سے ایک کا تعلّق سرزمینِ ایران سے ہے اور دوسرے کا برِّصغیر پاک و ہند (غیر منقسم ہندوستان) سے۔ اس طرح ان کے درمیان جغرافیائی لحاظ سے ہزاروں میل کی دُوری پائی جاتی ہے اور یہ کہ دونوں کا تعلّق بھی دو الگ الگ تہذیبوں سے ہے۔ اوّل الذّکر کا تعلّق ایرانی تہذیب سے ہے اور مؤخّر الذّکر کا ہندوستانی تہذیب سے۔ لیکن یہ مقامِ حیرت بھی ہے اور عین فطرت بھی کہ ان کے افکار و تصوّرات، جن میں فنِ شعر وادب، سیاستِ مدن، تاریخِ ملّت اور دین و مذہب کے تصوّرات شامل ہیں، کے مابین حد درجہ مماثلت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

---

۱ پروین شوکت علی، "اقبال کا فلسفۂ سیاسیات"، مترجم: ریاض الحق عبّاسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۱۱

۲ ان کے حالاتِ زندگی کے متعلّق تفصیلات کے لیے دیکھئے: عبد المجید سالک۔ ذکرِ اقبال، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

۳ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ۔ " اقبال اور سیاسیات "،ڈاکٹر سلیم اختر۔"اِقبالیات کے نقوش"،اقبال اکادمی،لاہور،۱۹۷۷ء، ص ص ۴۳۔۴۴

۴ "دیوانِ اشعار"، تصحیح: سیّد نصر اللہ تقوی،کتاب فروشی ابن سینا،امیر کبیر، تہران،۱۳۳۵

۵ عبد الرزّاق کانپوری، "سفر نامۂ ناصر خسرو"،مقدّمہ از مترجم،انجمن ترقی ادب، دہلی، ۱۹۴۱ء،ص ۱۵

۶ "دیوانِ اشعار"، مصحّحۂ تقوی، ص ۵۴۳؛ ترجمے کے لیے دیکھئے: فدا علی ایثار۔"دیوانِ اشعار پر ایک نظر"، "تذکرۂ سیّدنا پیر ناصر خسرو"،اطرب،پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء،ص ۱۷۶۔۱۷۷

۷ علامہ اقبال، " کلیات اقبال" (فارسی)،زیرِ سرپرستی جاوید اقبال،اسد پبلی کیشنز،لاہور،،ص ۷۶۳۔۷۶۴

۸ ایضاً

۹ محمد حسن الاعظمی، "انقلابِ مصر"، حصّہ اوّل، فرنٹیئر پبلشنگ کمپنی،اردو بازار،لاہور،۱۹۶۸ء،ص ۲۴

۱۰ محمد حسن الاعظمی، "انقلابِ مصر"، حصّہ اوّل، ص ۲۴

۱۱ پروین شوکت علی، "اقبال کا فلسفۂ سیاست"، مترجم: ریاض الحق عبّاسی، شیخ گلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، لاہور، ص ۱۶۰

۱۲ محمد اقبال،"کلیات اقبال" (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،لاہور،۱۹۷۵ء،ص ۳۳۲،"بالِ جبریل"،ص ۴۰

۱۳ ایضاً،ص ۱۱۸

۱۴ ایضاً،ص ۶۵۸،"ارمغانِ حجاز"،ص ۱۶

۱۵ ناصر خسرو، "دیوانِ اشعار"، باہتمام و تصحیح: مجتبیٰ مینوی، ناشر: دنیای کتاب، خیابانِ جمہوری شرقی، ۱۳۷۲، ص ۳۴۰

۱۶ محمد اقبال،"کلیات اقبال" (اردو)، ص ۶۵۸،" ضربِ کلیم "،"دین وہنر"،ص ۱۰۰

۱۷ ایضاً، ص ۵۸۰؛" ضربِ کلیم "،ص ۱۱۸

۱۸ ایضاً، ص ۵۹۰

۱۹ ناصر خسرو، "دیوانِ اشعار"،باہتمام و تصحیح: مجتبیٰ مینوی، ص ۶۰

۲۰ ایضاً، ص ۴۰۶

۲۱ ایضاً، ص ۹۴۔۹۵

22 K. G. Saiyidain. Iqbal's Educational Philosophy, Lahore, 1942, 99
اردو ترجمے کے لیے دیکھیے: خورشید احمد "اسلامی نظریہ حیات"، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۷۲ء،ص ۴۲۸

۲۳ اقبال، " کلیات اقبال" (فارسی)،ص ۶۶۳

۲۴ ناصر خسرو، " دیوانِ اشعار"، تصحیح باہتمام: مجتبیٰ مینوی، ص ۱۱

۲۵ ایضاً، " دیوان اشعار"، با تصحیح: سید نصر اللہ تقوی، چاپ آفٹ گلشن آبادماہ، ۱۳۴۸، صفحہ ۳۴۷

۲۶ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، "اقبال اور قرآن"، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۵

۲۷ ریاض احمد چودھری، " حیاتِ اقبال"، بزمِ اقبال، ۲۔ کلب روڈ، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۶۱

۲۸ اقبال، "رموزِ بے خودی"، ص ۱۲۳

۲۹ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، " اقبال اور قرآن"، ص ۴۷

۳۰ ناصر خسرو، " دیوانِ اشعار"، تصحیح: سیّد نصر اللہ تقوی، کتاب فروشی ابن سینا، امیر کبیر، تہران، ۱۳۳۵، ص ۱۷۵

۳۱ عبد المجید سالک، " ذکرِ اقبال"، بزمِ اقبال، لاہور، ص ۱۸۱

۳۲ محمد اقبال، "کلیات اقبال" (اردو)، ص ۳۹۰

۳۳ جابر علی سیّد، " تنقید اور لبرلزم"، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۲ء، ص ۶۵

۳۴ اقبال، " کلیاتِ اقبال"، ص ۱۳۳؛ بانگِ درا، ص ۱۳۳

35 Annemarie Shimmel, "Nasir-i Khusrau: The intelect against orthodoxy", *The News*, dailly,Karachi, 28, November, 1993,p. 5, column no.4-6